# دن رات کی پاکوبی

## ن م راشد بطور مترجم

توحید احمد

Tauheed Ahmed, in this article informs the reader about Rashed's translation of modern Persian poetry into Urdu, which was published collectively in 1987.

ادبی اردو کے ابتدائی ادوار میں اردو پر ترجمہ نگاری کی گہری چھاپ کے شواہد ملتے ہیں۔ اوائل میں زیادہ تر فارسی ادب پاروں کو اردو یا گیا، گو اس زمانے میں بلاطی زبان کی حیثیت سے ہندوستان میں فارسی کا طوطی بول رہا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی تحریک سے اردو نثر کا دامن تراجم اور لغات سے مالا مال ہونے لگا تھا۔ پھر دہلی کالج، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی، اورینٹل کالج لاہور اور جامعہ عثمانیہ میں ترجمہ کاری زور وشور سے جاری رہی۔ آزادی کے بعد جنوب ایشیا میں اردو کے دبستان کا شیرازہ بکھر گیا جس کا آتش کدۂ ترجمہ چند ایک چنگاریوں کے نکلنے کے بعد ٹھنڈا پڑ گیا۔

آغا حشر نے شیکسپیر کے ڈرامہ کو، میراجی نے نظم اور منٹو نے افسانہ میں انگریزی زبان سے کچھ نمونے ترجمائے لیکن ہمارے نثری ترجموں کا افق صرف انگریزی متون تک ہی محدود رہا چاہے ماخذی متن فرانسیسی شاعری ہو، روسی فکشن ہو یا جرمن ادب۔ یہ ن م راشد کا خاصہ رہا کہ انھوں نے جدید فارسی شعر کے انتخاب کو براہ راست اردو میں منتقل کیا جن کا مجموعہ ''جدید فارسی شاعری'' کے عنوان سے مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ ساٹھ نظموں پر مشتمل یہ



مجموعہ اردو میں ترجمہ کاری کا ایک درخشندہ نمونہ ہے۔ دو چار متفرق کاوشوں کے علاوہ اس قسم کے فرسٹ ہینڈ ترجموں سے اردو کا دامن ابھی خالی ہے۔

اس کتاب کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس میں فارسی نظموں اور ان کے اردو تراجم کو متوازی متون کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ ارادہ نیک تھا پر کتاب کی شکل میں لا کر اس کے مدیر اس توازن کو کھو بیٹھے اور پہلے چند صفحوں پر فارسی اصل چھاپ کر پھر اگلے صفحات میں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ہونا تو یوں چاہیے تھا کہ کتاب کے دائیں ہاتھ کے صفحے پر فارسی اصل اور اس کے مقابل بائیں ہاتھ کے صفحے پر اس متن کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا۔ فی الواقع یہ مجموعہ متوازی کی بجائے متواتر متون پر مشتمل ہے۔ مجلسِ ترقی ادب نے اس میں شکر تو ملائی پر کتاب پھیکی رہ گئی۔ اس کمی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو میں متوازی متون پر مشتمل کتاب شاید ہی دیکھنے کو ملے، ناپید ہیں۔ تو پھر ہم غیر ملکی زبان کس طرح سیکھ سکتے ہیں؟

ن م راشد نے ان تراجم کا کام ۱۹۶۰ء کے آخری سالوں میں تہران میں انجام دیا جہاں وہ اقوام متحدہ کے دفتر اطلاعات کے ڈائریکٹر کے طور پر متعین تھے۔ کتاب کی تمہید میں وہ کہتے ہیں کہ ''قدیم زمانے میں اردو شاعری کئی طرح سے فارسی شاعری سے متاثر ہوئی ہے۔ اس کے برعکس جدید فارسی شاعری نے براہ راست اردو شاعری پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ بلکہ جدید فارسی شاعری کے بارے میں ہمارے ہاں بڑی حد تک لاعلمی پائی جاتی ہے۔

تاہم یہ عجیب بات ہے کہ اردو اور فارسی میں جدید شاعری کی تحریک قریب قریب ایک ہی زمانے میں شروع ہوئی۔ اردو میں یہ تحریک ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ شروع ہوئی تھی اور فارسی میں اس کا ظہور ۱۹۳۵ء کے قریب ہوا۔ ہر چند دونوں زبانوں میں جدت کی تحریک مغربی شاعری سے متاثر ہوئی لیکن میرے خیال میں یہ محض انگریزی یا فرانسیسی شاعری کا اثر نہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ ان سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی حالات کا نتیجہ تھا جو اس وقت رونما ہو رہے تھے کہ دونوں زبانوں کے شاعروں نے آزادی کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا۔ اسی وجہ سے دونوں زبانوں کی شاعری نے قریب قریب متوازی راستے طے کیے ہیں۔

اس مجموعے سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ دونوں زبانوں کی جدید شاعری میں کس حد تک قرب پایا جاتا ہے۔ ہیئت اور زبان ہی کی تبدیلیاں ایک جیسی نہیں بلکہ رموز و کنایات کے نئے نئے تصورات، تجربات اور تاثرات کی انفرادیت، موضوعات میں تنوع کی تلاش اور نئے علوم کی روشنی میں زندگی کی نئی تعبیر کی کوششیں بڑی حد تک یکساں ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دونوں زبانوں کی شاعری میں اب قدیم شاعری کی غربت اور واماندگی کا سراغ کم ملتا ہے۔ وہ قدیم شاعری جو خود غرض لیکن ستم رسیدہ عشق کی پیداوار تھی اور جس کی آبیاری اخلاق اور تصوف کے مسلمہ نظریات کیا کرتے تھے۔ آج کی شاعری میں محض زندگی سے اکتاہٹ نہیں پائی جاتی بلکہ مجموعی بے اطمینانی کا پرتو ملتا ہے اور اسی وجہ سے شاعر اپنے ذاتی وصال کا متمنی کم ہے اور زندگی کو اس کے فرسودہ شیون سے نجات دلانے کا خواہاں زیادہ۔ دونوں زبانوں کی شاعری نے ایسی دنیائیں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جن میں حسن اور عشق کا مفہوم نیا ہو۔ جن میں حقیقت اپنی پوری سادگی اور بے ریائی کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ اور جن میں انسان کی روح پورے طور پر آزاد ہو سکے۔ دونوں زبانوں کی شاعری میں ''ابہام'' پایا جاتا ہے یعنی ان لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں جن کا اپنا احساس پرانا ہے اور جنہوں نے زندگی کے نئے نئے مظاہر سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے تفاہیم کے نئے نئے راستے کھلتے جا رہے ہیں۔''

یوں راشد صاحب نے ہمارے لئے ایک جدید علم کے دروازے کھول دیے جس کو دنیا ''تقابلی ادب'' کے نام سے جانتی ہے۔ ترجمے کے باقاعدہ مطالعہ کو ''علومِ ترجمہ'' پکارا گیا ہے جس کی شروعات تقابلی ادب سے جڑی ہیں۔ تقابلی ادب کی ایک تعریف یوں کی گئی ہے کہ ''تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متون کا مطالعہ ہے، ایک بین العلمی مضمون ہے اور مکان اور زبان کے بعد میں پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوش سے متعلق ہے۔''

(Susan Bassnett: Comparative Literature: A Critical Introduction, Blackwell, London, 1993)

راشد صاحب کے اس اقتباس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس نادر مجموعے کے ذریعے نہ صرف اردو شاعری کو ثروت عطا کی بلکہ تقابلی ادب کی جانب پیش قدمی کی دعوت بھی



دی ہے۔

پروفیسر بسنیٹ نے اپنی کتاب میں مزید بتایا ہے کہ ''مطالعے کا شوق رکھنے والا کوئی شخص ایک ایسی راہ پر گامزن ہوتا ہے جسے تقابلی ادب کہا جا سکتا ہے۔ چاسر کو پڑھتے ہوئے ہمارا تعارف بوکاچیو سے ہوتا ہے۔ شیکسپیئر کے مصادر تک رسائی ہمیں لاطینی، فرانسیسی، ہسپانوی اور اطالوی زبانوں کے ذرائع سے ملتی ہے۔۔۔ ہم اس قسم کی بے شمار مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ قرات کا عمل شروع کرتے ہی ہم سرحدیں عبور کرتے ہوئے نئے تعلقات اور رشتے قائم کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک واحد ادب تک محدود کرنے کی بجائے ادب کے وسیع تر عالمی میدان میں اتر جاتے ہیں جس کے لئے گوئٹے نے عالمی ادب (Weltliteratur) کی اصطلاح استعمال کی۔''

راشد صاحب نے مندرجہ بالا اقتباس میں ایسے ہی نئے تعلقات اور رشتوں کی ایک مثال پیش کی ہے۔

جدید ایرانی شاعر منوچہر آتشی (۲۰۰۵ - ۱۹۳۱) کی ایک مختصر نظم 'پرسش' کے راشد صاحب کے اردو ترجمے بعنوان 'ایک سوال' سے کچھ سطریں پڑھتے ہیں:

''یہ جلے ہوئے سوگوار بادل
سورج کے تابوت کو کہاں لے جا رہے ہیں؟
یہ پیاسی ہوائیں، حریص اور دیوانہ وار
کس باغ کے نیلگوں سراب کے تعاقب میں
افق کے قلعوں کی دیوار کے نیچے
گھبرائی ہوئی، سراسیمہ چلی جا رہی ہیں؟
اب صحراؤں کے ننگے درخت
کس مسافر کی نومیدی کی التجا
اور کس کی خستگی کی ابتدا ہیں؟

ان سطور پر ترجمہ ہونے کا شائبہ بھی نہیں گزرتا کیونکہ یہ راشد صاحب کی بدیہی نظم سنائی دیتی ہے۔ ان جیسے صاحب علم، صاحب دل اور ماہر شاعر کے قلم سے کیسا عمدہ ترجمہ ہوا ہے۔ یہ کتاب تو تدریسی مواد کا رتبہ رکھتی ہے لیکن ہماری کسی یونیورسٹی میں تقابلی ادب کا مضمون تو رائج ہو!

اپنے دیوان ''ایران میں اجنبی'' کے دیباچے میں راشد صاحب کہتے ہیں کہ جدید دور کے ''ایک مکان کی نئی ساخت ہی کو لیجئے۔ اس نے غزل اور مثنوی کا عشق ناممکن کر دیا ہے۔'' یونہی اردو نثر کو بھی ترقی کرنا ہے اور زبان کی تعلیم و تدریس میں تقابلی ادب اور علوم ترجمہ جیسے جدید مضامین شامل کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ یوں نہ صرف ہم اپنے ترجموں کو تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم کریں گے بلکہ ترجمہ کے ساتھ ترجمے کے رتبے کو ذیلی کارکن کی کارروائی سے بلند تر اٹھا سکیں گے۔ یوں اردو زبان بھی نئے نئے علوم کے لئے اپنی استعداد بڑھا سکے گی جو کہ عصرِ حاضر کی فوری ضرورت ہے۔